جلد02شمارہ۱۸،۲۰۲۴

Article

Tanveer Anjum's Poetry: Dimensions of Alienation in a Neo-Feminst Perspective

تنویر انجم کی شاعری بیگانگی کی جہات۔نو تانیثی تناظر

Zahid Hussain[*1] **Dr. Samia Komal**[2]

[1] Lecturer, Urdu Department, Govt. Graduate College, Jampur

[2]Assistant Professor, Urdu Department, Emerson University, Multan

*Correspondence:

زاہد حسین،[1] ڈاکٹر سامیہ کومل،[۲]

[۱]لیکچرار، شعبہ اردو، گورنمنٹ گریجوئیٹ کالج جام پور [۲]اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ایمرسن کالج، ملتان

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:06-۰7-2024
Accepted:26-۰9-2024
Online:27-۰9-2024

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: Historically, humans engaged in communal activities , storytelling, scholarly discussions, and festive gatherings that fostered a sense of belonging. However, with industrialization and technological advancements, human interactions became increasingly mechanical, favoring utility over intimacy. This detachment led to a profound sense of alienation as individuals turned inward, grappling with existential solitude.Erich Fromm describes alienation as the condition where individuals perceive themselves as impoverished beings, disconnected from their creations and surroundings. Alienation manifests as psychological distress, impacting individuals' identity, relationships, and societal roles.

Anjum's poetry encapsulates the alienation of women in patriarchal societies, portraying their solitude and existential battles as both personal and universal experiences.This article explores the multifaceted nature of alienation ,its philosophical, economic, and gendered dimensions while analyzing its representation in existentialist literature and urdu poetry of Tanveer Anjum. By doing so, it sheds light on the enduring relevance of existential thought in addressing the crises of identity and alienation in contemporary society especially among women.

Keywords: Tanveer Anjum, Coomunal activities, Carl Marx, Feminist, Alienation

ارسطو کے مطابق " انسان معاشرتی حیوان ہے " یعنی انسان کے لیے معاشرے سے کٹ کر زندگی گزارنا بڑا مشکل ہے۔ پہلے پہل معاشرے میں لوگ ایک دوسرے سے مختلف بہانوں اور موقع پر ایک دوسرے سے ملاقات اور ایک دوسرے کے پاس آنا جانا لگا رہتا تھا کوئی کہانی سناتا تھا۔ کوئی کہانی سناتا اور لوگ اسے سن رہے ہوتے تھے۔ کسی عالم کے پاس لوگ جاتے اور ایک علمی محفل سج جاتی۔ مقامی تہوار پر عید ملن پر لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوتے تھے۔ لیکن جب انسان ایک دوسرے سے بے محتاج ہونا شروع ہوا۔ جوں جوں انسان کی ضروریات مشینوں پر منحصر ہونے لگیں، وہ اپنے جیسے انسانوں سے زیادہ مشینوں کے قریب ہوتا گیا۔ اس رجحان نے انسان کو آہستہ آہستہ سماجی زندگی سے دور کر دیا۔ سماج سے کٹ کر جب انسان نے تنہائی میں اپنی ذات کی طرف رجوع کیا، تو اس نے خود کو بیگانگی کی گہری کیفیت میں مبتلا پایا۔ سماجی تعلقات کے ختم ہونے سے انسان کی شخصیت میں اجنبیت سرایت کر جاتی ہے، اور وہ خود کو دوسروں سے الگ تھلگ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایرک فرام کا کہنا ہے کہ ماضی میں آزادی کی کمی کی وجہ سے بیگانگی کا احساس محدود تھا، لیکن جوں جوں آزادی بڑھتی گئی، بیگانگی کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اس حوالے سے کہتے ہیں:

> "Alienation is the condition in which a person no longer perceives themselves as the active agent of their own abilities and wealth but instead as a diminished 'object,' reliant on forces external to their own being.” (1)

انسان جب وجود کی معدومیت کا شکار ہو جاتا ہے تو اس انہدام کے نتیجے میں اس کا اصلی جوہر ذات سامنے آتا ہے۔ انسانی وجود وقت کے سمندر میں ابھرتا ڈوبتا اور سنبھلتا رہتا ہے۔ وجود کی اتھاہ ہو یا دنیاوی مظاہر کی کہانی یہ علامت کر طویل راستہ ہے جس پر چلتے چلتے انسان غمگین، حضطرب، افسردہ، صاحب استقرام اور بیگانہ ہو گیا ہے۔ لغویت اور لاتعلقی کا یہی بحران بیگانگی کی اصل بنیاد ہے۔

بیگانگی ایک ذہنی کرب ہے جو ہر انسان پر کسی بھی حوالے سے اپنا اثر دکھا سکتی ہے۔ لہذا بیگانگی سائنس، مذہب اور منطق کی کلیت سے انحراف کر کے انسان اپنے وجود میں سفر کرنے سے عبارت ہے۔ یہ فلسفہ کی اصطلاحی ہے البتہ اس کو ادب میں خاطر خواہ پذیرائی ملی۔ یہ آج کے صنعتی انقلاب کے بیچ میں بسنے والے کرب زدہ انسان کو مضبوط بناتی ہے۔ یورپ میں جب اقلیت کا رجحان بڑھا سائنس پر اعتماد اور اعتقاد بہت بڑھ گیا ہے یورپ سے تعلقات کم ہوتے۔ صنعتی ترقی نے " صرفیات اور صارف " میں الجھا دیا جس کی وجہ سے انسان عدم شناخت کی چھتری میں آ گیا۔ ان رجحانات کے رد عمل اور انسان کی شناخت اور پہچان کو واضح کرنے کے لئے وجودی فلسفہ میدان عمل میں آیا۔ اس نے مذہبی، سماجی اور معاشرتی اقدار کو چیلنج کیا۔ خدا کو طفل تسلی کہا۔ اس فلسفہ میں فرد واحد کا وجود بنیادی اہمیت رکھتا ہے شاہین مفتی لکھتی ہیں کہ :

> " صنعتی معاشرے کے اہم شخصیتیں کو جنم دینے والی قوتوں کے خلاف ایک فکری بغاوت ضروری سمجھی گئی۔ وجودیوں نے اندازہ کیا کہ شخص کو ان عناصر سے محفوظ رکھنا ضروری ہے

> جو اس کی آزادی کو سلب کرتا ہے جو مروجہ نظام کے انفرادی تک کے لیے سم قاتل ہے۔ یہ فرد کو ایک کل پرزے کے طور پر استعمال کر رہا ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں تنہائی اور بیگانگی کا عمل دخل بڑھ رہا ہے۔ یہ فلسفہ فرد واحد اس کی اہمیت یا اس کے مسائل کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وجودیت کے پیروکاروں نے فرد واحد کے مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا"۔ (۲)

بیگانگی کی وجوہات میں اہم وجوہات نو آبادیات کا قیام اور عالمی جنگیں ہیں جن کی وجہ سے عوام میں اجنبیت پھیلتی گئ۔ نو آبادیات اور جنگوں میں قتل عام کی وجہ سے انسان کی قیمت ختم ہو گی۔ جنگ زدہ اور تیسری دنیا کے مقبول اور مظلوم لوگوں نے اپنا اسباب چاہا اور اسی اس بات کے پیچھے بیگانگی کا ہاتھ ہے۔ جدوجہد اور کوشش کی طرف فرد اور قوم کی رہنمائی کرتی ہے۔ شاہین مفتی کا کہنا ہے کہ:

> "فرانس کی شکست وریخت، ایشیا، مڈل ایسٹ، لاطینی، امریکا، کشمیر، فلسطین کی مقامی جنگ اور انسان کی بے حشیتی کا نہ ختم ہونے والا ڈرامہ جاری و ساری ہے ان انتہائی صورتوں میں وجودیت کاری اور سامنے کی آواز بن گئی ہے کیونکہ وجودیت ایک لحاظ سے برائی کے خلاف فرد کا مزاحمتی رویہ بھی ہے جو فرد کا ثبات ہے۔"۔(۳)

وجودی فلسفہ کے نزدیک انسان سب سے اہم ہے۔ انسان کا مرکزی نقطہ انسان کا وجود ہے۔ وجود کی کیفیت کیا ہے ؟وجود کی سمت آمادہ سفر ہے ؟ اور کیوں ہے۔ ان باتوں کی تلاش وجودیت کا فلسفہ میں جاری و ساری رہتی ہے۔ آج کے سماج میں انسان اپنے آپ کو اجنبی سمجھتا ہے۔ انسان ایک بے خانماں زندگی گزار رہا ہے اور اس کی زندگی انسان سے ہی مقابلہ کرتے کرتے گزر جاتی ہے۔ قاسم شاہ کا کہنا ہے کہ:

> "وجودیت جہاں زندگی کے لوگوں اور بے معنی ہونے کا تصور دیتی ہے وہی اراد اور عمل کی آزادی پر بھی زور دیتی ہے"۔(۴)

اس طرح وجودی نقطہ نظر ایک لایعنیت دوسری لایعنیت کا نام ہے۔ جس میں دوران سفر، جدوجہد پر زور دیا جاتا ہے۔ افتخار بیگ کا کہنا ہے کہ:

> "ہمہ جہد وجہد کے اثبات کے لئے ضروری بھی ہے۔ وہ ہر سمے بے چین و بے قرار ہوا کرتا ہے۔ کہ کسی بھی صورت اپنے آپ کو تسلیم کروائے۔ سکوت و سکون اس سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ جبکہ سماجی صورت میں وہ اپنے آپ کو مس فٹ محسوس کرتا ہے اور یوں اپنے آپ کو ہوم لیس کر لیتا ہے۔ اسے لگتا ہے جدوجہد کا جذبہ اسی تنہائی اور بیگانگی سے کسی چشمے کی مانند پھوٹ پڑتا ہے"۔ (۵)

بیگانگی کا ایک تصور کارل مارکس بھی دیتا ہے جس کا محور معیشت سے یعنی فرد کی اپنی محنت سے بیگانگی اس بارے میں مارکس کہتا ہے کہ :

> "Production is a process of objectification, where individuals create material objects that embody human creativity but exist as entities separate from their creators. Alienation arises when individuals no longer recognize themselves in the products they have created. These products, now alien and disconnected, take on an independent and opposing power. However, objectification becomes alienation specifically under the historical conditions of capitalism. In a capitalist society, one group, the capitalists, appropriates the products created by others, leading to the emergence of alienation." (۲)

جنسی بیگانگی میں دو طرح کے عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ مرد اور عورت کے درمیان عدم مساوات اور جنسی امتیاز، یعنی "جنڈر ڈسکریمینیشن"، عورت کے استحصال کی بنیاد بنتے ہیں۔ یہ مسئلہ ہر معاشرے یا طبقہ فکر کا نہیں، لیکن مرد کی بالادستی والے معاشروں میں عورت کے حقوق کی پامالی عام ہے، جس سے وہ اجنبیت اور بیگانگی کے گہرے احساس میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں عورت خود کو تنہا، غیر محفوظ، اور محروم محسوس کرتی ہے، جبکہ بے چینی، غصہ، اور بدلے کی کیفیت اسے سماجی طور پر مزید الگ تھلگ کر دیتی ہے۔ مادیت پرست معاشروں میں، جہاں ہر شے کو محض "صارف" کی نگاہ سے پرکھا جاتا ہے، عورت کا استحصال مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ اسے ایک تجارتی حربے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ اسے بطور "سیلز آفیسر" پیش کیا جاتا ہے تاکہ کاروبار کو پرکشش بنایا جا سکے۔ معاشی دباؤ کے تحت عورت ایسی ملازمت اختیار کر تو لیتی ہے، لیکن وقت کے ساتھ وہ شدید ذہنی تناؤ اور اضطراب کا شکار ہونے لگتی ہے۔ اس کا یہ داخلی کرب، بے حیثیتی کے احساس کو مزید بڑھا دیتا ہے اور بالآخر اسے اجنبیت اور بیگانگی کے گہرے جال میں جکڑ لیتا ہے۔
شیلا گریگر لکھتی ہیں کہ:

> "The most significant transformation lies in the increasing participation of working-class women, who have long been part of the production process. Today, the majority of women are employed outside the home, and this economic independence from men has contributed to a rise in divorce rates,

a decline in traditional marriage, and a growing prevalence of single-parent households."(۷)

دوسری جنسی بیگانگی کا تعلق جنسی عمل سے ہے۔ اگر کوئی فرد جنسی ناآسودگی کا شکار ہے تو اس میں اضطراب اور معاشرے سے بیگانگی کی کیفیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ مارکسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معاشی سطح پر کمزور لوگ (بلا امتیاز مرد وزن) جنھیں اپنی مرضی کے مطابق جنسی عمل کا موقع نہیں ملتا، وہ اپنے آپ کو معاشرے میں کم تر خیال کرتے ہیں۔ یہی احساس کمتری ان میں بیگانگی کو فروغ دیتا ہے۔ اسی طرح معاشی طور پر مضبوط لوگ جنسی استحصال کرتے ہیں۔ وہ اپنی تسکین کے لیے کسی بھی سطح تک اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہیں۔ مخالف کو حاصل کرنے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنے تمام تر وسائل کا استعمال کرتے ہیں اور مخالف کو اپنا غلام سمجھتے ہیں ۔ایسی صورتحال میں تحلیل نفسی نہیں ہو سکتی محض جنسی عمل ہو سکتا ہے۔ یہ چیز مایوسی، دہشت، اضطراب، انکار اور غصے جیسی کیفیات کو جنم دیتی ہے۔ پدر شاہی نظام پر نگاہ ڈالی جائے تو اس نے ہمیشہ ایسے عوامل پیدا کیے جنہوں نے عورت کو اس کے ماحول اور بذات خود اکی ذات سے بیگانہ کیا۔ تولیدی محنت ایک ایسا عمل ہے جس سے عورت کو گزرنا پڑتا ہے اور اسے بس یہی احساس دلایا جات ہے کہ وہ محض بچے کو جنانے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ The Second Sex میں، سیمون دی بووا نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ خواتین کو ایک اجنبی اور بیگانہ کے کردار میں محدود کر دیا جاتا ہے، ان کی انفرادیت سے انکار کیا جاتا ہے اور انہیں حیاتیاتی افعال تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

"Woman is riveted into a domestic role that alienates her from her individuality'(۸)"

عورت کو صارفی کلچر میں ایک پروڈکٹ کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اسے ناچاہتے ہوئے بھی یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ اپنی نسوانیت کے ذریعے کنزیومر پیدا کر سکتی ہے۔ پدر شاہی ثقافت تقاضا کرتی ہے کہ خواتین اپنی خواہشات سے خود کو الگ کریں تا کہ مردانہ تصورات کے مطابق ہوں۔ انہیں بطور ضرورت پیش کیا جاتا ہے۔ خواتین کی غیر ادا شدہ نسوانی محنت سرمایہ دار معیشتوں کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ سرمایہ خواتین کی محنت کے استحصال پر بنایا گیا ہے۔

عورت میں جنم لینے والی بیگانگی کی ان مختلف صورتوں اور اس سے اٹھنے والے کرب کو تنویر انجم کے کلام میں نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تنویر انجم (۱۹۵۶ء) کا پہلا مجموعہ ''ان دیکھی لہریں'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں موجود نظمیں ''نئی نظم'' کی نسائی آواز ہیں۔ تنویر انجم نے عورت کے مسائل کو ایک فرد کی حیثیت سے دیکھا۔ عورت کی زندگی جیسے معاشرے میں بہت سے تضادات سہنے پڑے۔ تنویر انجم کی نظمیں اسی عورت کی آواز ہیں۔ تنویر انجم اپنی شاعری کے بارے میں خود لکھتی ہیں:

''میں سمجھتی ہوں کہ میری نظمیں جدید ماحول سے ہم آہنگ اور غیر منصفانہ معاشرتی اقدار سے متصادم ایک عورت کی زندگی کی آئینہ داری کرتی ہیں اور اس لحاظ سے نسوانی طرزِ احساس و فکر کی نمائندہ بھی ہیں۔''۔(۹)

تنویر انجم کی زیادہ تر نظمیں کرداری ہیں۔ ان نظموں کے پیشتر کردار غیر ملکی ہیں۔ یہ کردار مختلف پیشوں اور مختلف سماجی اور معاشی طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تنویر انجم نے ان کرداروں کے ذریعے عصرِ حاضر کے انسان کو درپیش مسائل کو پیش کیا ہے۔ یہ کردار مختلف پیشوں اور سماجی و معاشی طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے تنویر انجم نے عصرِ حاضر کے انسان کو درپیش مسائل اور چیلنجز کو پیش کیا ہے۔ ان کی نظموں میں تانیثیت کے حوالے سے ایک گہرا معاشرتی شعور جھلکتا ہے۔ تنویر انجم نے اپنی شاعری میں عورت کے معاشرتی مقام پر تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ دکھاتی ہیں کہ کس طرح مردانہ غلبے والا معاشرہ عورت کو اپنے بس میں کیے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اسے اس کا جائز حق نہیں دیتا۔ ان کی نظمیں اس ناانصافی کو نمایاں کرتی ہیں اور عورت کے جذباتی ونفسیاتی کرب کی عکاسی کرتی ہیں۔ تنویر انجم کی نظموں کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ عورت کی اپنی ذات سے بیگانگی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کے دکھ بانٹنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اسے اپنی تنہائی کا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے، اور یہ تنہائی اکثر اسے بے معنی محسوس ہوتی ہے، گویا یہ اس کے مقدر کا حصہ بنا دی گئی ہو۔ تنویر انجم اس المیے کو بڑی فنکارانہ مہارت سے اپنے شعری اظہار کا حصہ بناتی ہیں۔ ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

> ”ایک نئی آگہی اُن کی نظموں میں ظاہر ہوتی چلی گئی ہے کہ دنیا میں سب سے چھوٹی بڑی اشیاء آپس میں جڑی ہیں، لیکن انسان کی تنہائی اس کی تقدیر ہے۔“(۱۰)

عورت کی تنہائی اس کا نصیب بن جاتی ہے، اور وہ چاہ کر بھی اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کرپاتی۔ یہ بے بسی اُسے اپنی ذات سے بیگانہ کردیتی ہے۔ جب کوئی فرد اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتا ہے، تو وہ سماج سے بھی ہم آہنگی قائم نہیں کرپاتا۔ اپنی تنہائی سے نجات پانے کی کوشش میں وہ اپنی ذات کے ساتھ مسلسل کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ کشمکش ایک گہری اذیت بن جاتی ہے، اور اس کا درد اُس کی لامحدودیت میں بدل جاتا ہے۔ اس تنہائی اور خود سے جاری جنگ کا کوئی متعین وقت نہیں ہوتا؛ یہ ایک نہ ختم ہونے والی کیفیت ہوتی ہے جو فرد کی ذات کے اندر گہرائی اختیار کرلیتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اُس کے دکھ اور کرب کو مزید شدید کردیتی ہے۔

حساس فرد کی تنہائی کو دیکھنے والے تو بہت ہوتے ہیں، لیکن اس تنہائی کو بانٹنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص اس تنہائی کو کم کرنے کا ارادہ بھی کرے، تو وہ مستقل سہارا فراہم کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ تنویر انجم کے نزدیک، عورت کی تنہائی ایک ازلی حقیقت ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ سماجی عمل میں شامل ہونے یا اپنی تنہائی سے فرار کے تمام راستے عارضی ثابت ہوتے ہیں۔ وہ شخص جو وقتی طور پر سہارا بننے کی کوشش کرتا ہے، وہ بھی جلد یا بدیر منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔

فرد کی یہ حالت، جو ایک طرح کی جبری تقدیر کی مظہر ہے، ہمیشہ اس کی تنہائی کے ذریعے خود کو ظاہر کرتی ہے۔ وقتی مشاغل میں مشغول ہو کر فرد کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی تنہائی، اپنی ذات کی کشیدگی، اور خود سے بیگانگی پر قابو پالیا ہے۔ مگر قدرت ہمیشہ اپنے قوانین کے تحت عمل کرتی ہے، اور فرد کو ایک بار پھر اس کی تنہائی کی حقیقت سے روشناس کرادیتی ہے۔ تنویر انجم نے اپنی نظم ”تنہائی کی بے ایمان چیمپئن“ میں اس ازلی اور ناقابلِ فرار کیفیت کو قدرت کے کھیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ اس کیفیت کو "سولیٹیئر" جیسے تنہائی کے کھیل کے استعارے کے ذریعے نہایت مؤثر انداز میں بیان کرتی ہیں، جو اس نظم کو ایک علامتی گہرائی عطا کرتا ہے۔

وہ کسی سے یہ نہیں کہتی
کہ سولیٹیئر میں زندگی کے بر خلاف
اچھی بات یہ ہے
کہ ایک نامعلوم، غیر مرئی دشمن کے ساتھ
مکمل طور پر قسمت پر منحصر
تنہا بے معنی، لاحاصل مقابلے میں
اُسے بے ایمانی سے
کوئی روک نہیں سکتا۔"(۱۱)

یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اگرچہ فرد کو عارضی طور پر آزادی حاصل ہو جاتی ہے اور وہ اپنی تنہائی سے عارضی طور پر چھٹکارا پالیتا ہے، لیکن یہ آزادی صرف جز وقتی ہوتی ہے۔ وہ اپنے اندرونی حریف، یعنی اپنی تنہائی کو کچھ دیر کے لیے شکست دے سکتا ہے، لیکن یہ "غیر مرئی دشمن" دراصل اس کی اپنی ہی بیگانگی ہے، جس سے وہ عارضی مصروفیات میں خود کو وقتی طور پر الگ کر لیتا ہے۔ تاہم، آخر کار انسان کو تھک کر اپنی اصل حقیقت، اپنی تنہائی کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔ یہ عارضی سکون اور اپنی ذات کی بیگانگی سے آزادی محض ایک وقتی دھوکہ ہے۔ وہ اس حالت میں کچھ وقت کے لیے خود کو آزاد محسوس کرتا ہے، لیکن یہ محض ایک چھوٹا سا تماشا ہے جس کا کوئی مستقل اثر نہیں ہوتا۔ ناصر عباس نیر اس نظم کے بارے میں فرماتے ہیں:

"سولیٹیئر اس لیے مختلف ہے کہ اس میں کوئی حریف نہیں ہوتا۔ کیسا پیراڈکس ہے کہ کھیل بھی ہو اور حریف کے بغیر۔ سب فیصلوں کے اختیار، یہاں تک کہ قدری فیصلوں کا اختیار بھی، ایک ہی آدمی کے پاس ہے۔ گہری نفسی سطح پر وہ ایک ایسی تنہائی سے دوچار ہے جسے کوئی بانٹ نہیں سکتا۔"(۱۲)

تنویر انجم کی شاعری میں یہ تنہائی ایک ایسی کیفیت بن جاتی ہے جو فرد کی اصل حقیقت کو دریافت کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ تنہائی اس وقت تک فرد کے دکھوں کا مداوا بنتی ہے، جب انسان اس میں اپنی ذات کو پہچاننے لگتا ہے۔ اس تنہائی میں انسان خود سے ہم آہنگی تلاش کرتا ہے، کبھی اپنے ہمزاد کو اپنی تنہائی کا ساتھی سمجھ لیتا ہے، اور کبھی اپنے ذہن کی گہرائیوں میں جا کر اس سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ بیگانگی کی کیفیت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ان دونوں تجربات کے ذریعے فرد اپنی تنہائی سے نجات پانے کی کوشش کرتا ہے اور ایک ایسا عالم تخلیق کرتا ہے جہاں اسے کسی بیرونی مداخلت کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے دل میں ایک خواہش جاگتی ہے کہ وہ جو تنہائی اور سکون کا عالم تخلیق کیا ہے، اس میں کوئی بھی بیرونی خلل نہ ڈالے، کوئی اور مداخلت نہ کرے۔ اس کی تنہائی اس کی ذات کی گہری تفہیم اور ہم آہنگی کا نتیجہ بن چکی ہوتی ہے۔

فرد اپنی تنہائی کی شدت اور خفت سے نجات پانے کے لیے اکثر ایک خیالی پیکر تخلیق کرتا ہے جو اس کے اندر کی خلش کو کم کرے اور اس کی تنہائی کے عذاب کو بانٹ سکے۔ تنویر انجم نے بھی اپنی نظم میں نیلو فر کے کردار کو تخلیق کیا، جو اس کی ذاتی بیگانگی کو کم کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ نیلو فر ایک علامتی کردار ہے، جو فرد کو اس کی بیگانگی سے بچانے کے لیے ایک سہارا بنتی ہے۔ یہ خیالی کردار فرد کی داخلی خلاء کو پر کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اسے اپنی تنہائی میں ایک ساتھی فراہم کرتا ہے۔ نیلو فر فرد کی تنہائی کے عذاب کو بانٹنے والی ایک مضبوط شخصیت کے طور پر ابھرتی ہے۔ اس کا کردار فرد کو بیگانگی کے احساسِ جرم سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کی مدد سے وہ اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ ہو پاتا ہے۔ نیلو فر ایک خیالی ہمزاد کے طور پر فرد کی زندگی میں اس کا ہمراز بن کر آتی ہے، اور اسے اپنے اندر کی تنہائی اور بیگانگی سے نجات دلانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ نظم ''نیلو فر اور میں'' میں تنویر انجم کہتی ہیں:

" ''نیلو فر کو میں نے اس وقت خلق کیا جب تنہائی ایک خوفناک اور ناقابلِ شکست دیوار بن گئی تھی۔ ایک ایسے دن کے دامن سے، جسے ایک تھکا دینے والے کام کے اختتام نے اچانک بے حد خالی اور بے معنی کر دیا تھا۔''(۱۳)

یہ حقیقت تنویر انجم کی نظموں میں گہرائی سے ظاہر ہوتی ہے کہ تنہائی سے اور اپنی ذات کی بیگانگی سے چھٹکارا پانے کی تمام تر ترکیبیں محض عارضی ہوتی ہیں۔ فرد اپنی تنہائی کو وقتی طور پر بھولنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن یہ خیالات اور ترکیبیں دیرپا نہیں رہتیں۔ حقیقت میں، جب یہ خیالات ٹوٹ جاتے ہیں، تو فرد کو دوبارہ اپنی تنہائی کے گہرے اندھیروں میں گھری خوف کی زندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نیلو فر جیسے خیالی پیکر، جو وقتی طور پر تسکین دیتے ہیں، حقیقت کے سامنے بے معنی ثابت ہوتے ہیں۔ فرد کا اندرونی کشمکش اور تنہائی کا سامنا پھر سے شدت اختیار کر لیتا ہے، اور اسے اپنے اندر کی بیگانگی سے دوبارہ لڑنا پڑتا ہے۔ یہ کیفیت فرد کی اصل حقیقت کا حصہ بن جاتی ہے، جس سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔

تنویر انجم کے کلام میں ''ذہنی بیگانگی'' کا ایک سبب Nosteligia بھی ہے۔ فرد وقت کے دھارے میں بہتا ہوا اپنے آپ اور اپنے پیاروں سے بہت دور نکل جاتا ہے۔ پھر کسی فرحت کے لمحے میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو سوائے یادوں کے خبار کے اور اکیلے پن کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہیں سے فرد کی ذہنی بیگانگی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وقت کی سوئیاں واپس مڑ جائیں اور جن رشتوں سے فرد دور نکل آیا ہے۔ وہ اُسے دوبارہ مل جائیں مگر ایسا کرنا ممکن نہیں رہتا۔ یہ بے بسی فرد کو ذہنی بیگانگی یا نفسیاتی بیگانگی سے دوچار کرتی ہے۔ اپنوں کو کھو دینے کا دکھ اور اپنے قیمتی وقت کو گنوا دینے کا دکھ ذہنی انتشار کا سبب بنتا ہے اور فرد نفسیاتی طور پر بیگانہ زندگی ہو جاتا ہے۔ تنویر انجم نے اپنی نظم میں Nostelgia کے احساس جرم میں مبتلا اسی بیگانہ ذہن شخص کی عکاسی اس طرح کی ہے:

''ہم سے مت پوچھنا
اُس ملن کی تڑپ
جو بھنور ہو گیا

دل میں اک درولی وحشتوں میں گھری

آندھیوں نے کہا

اور کچھ دیر تک

ساری تنہائیوں کی

نمی اوڑھے

آؤ مڑ کے چلو"(۱۴)

لوٹ جانے کی یہ آرزو، وہ ذہنی کیفیت ہے جس میں شخص چاہتا ہے کہ وہ وقت ہر اُس کی گرفت ہو۔ فرد جس طرح چاہے وقت کا استعمال اُسی طرح کرے۔ وہ اپنے اندر ایسی قوت کی متلاشی ہے جو وقت کو روک سکے۔ مگر جب وہ اپنے آپ کو اس معاملے میں بے بس اور لاچار پاتا ہے تو ذہنی اضطراب میں چلا جاتا ہے۔ تنویر انجم کا یہ کہنا کہ:"اے کم ظرف عہد! کاش تو میری کشتی کا سمندر نہ بنتا"() تو وہ دراصل اپنے وقت سے مخاطب ہیں جو سمندر کی طرح وسیع ہے۔ اس کی ابتدا اور انتہا کی کسی کو خبر نہیں ہے۔

فرد اپنے وجود کی آزادی کے لیے وقت کو شکست دینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ وقت لگے بندھے اصولوں سے انحراف کر کے ایک ایسی زندگی کا خواہاں ہوتا ہے جہاں اس کے وجود کو گھڑی کے بازو اپنی گرفت میں نہ لے سکیں۔ یہ آزادی معاصر وقت کے نظام سے نکلنے کی بھی ہوتی ہے ایک ایسا فرد جو اپنے عہد کے نظام کہنہ سے اُکتا گیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُسے زندگی کے نئے قرائن میسر آسکیں۔ اس لیے موجودہ تمام سانچوں کو اور ہر قسم کی رسم و روایات سے بغاوت کو خواہاں ہوتا ہے۔ تنویر انجم نے بھی وقت کو استعارہ بنا کر اس تصور کو اس طرح پیش کیا ہے:

"میں کہتی ہوں

وقت کے خانے توڑ رہی ہوں

میں وقت کو ہوا، مٹی، پانی اور آگ میں پھینک رہی ہوں

میں وقت کو جسم سے آزاد کر رہی ہوں

اور زنجیروں سے انکار کے لیے

اپنے کاٹ دیے جانے والے ہاتھوں کو ڈھونڈ رہی ہوں"(۱۵)

تنویر انجم کا فہم و ادراک زندگی کے نشیب و فراز کو گہرائی سے سمجھتا ہے اور خاص طور پر سماجی رویوں کی تنقید کرتی ہے۔ وہ عورت کی صورتحال کو اس انداز میں پیش کرتی ہیں کہ اُسے اکثر سماج کی محدود اور جکڑی ہوئی سرحدوں میں مقید رہنا پڑتا ہے، جہاں اُسے اپنی شناخت اور مقام کے بارے میں کم ہی شعور ہوتا ہے۔ جب عورت کا سامنا سماج سے ہوتا ہے تو وہ دھوکہ، فریب اور مفاد پرستی کے شکار

ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ سماج سے بیگانہ ہو جاتی ہے اور اُس سے دوری اختیار کر لیتی ہے۔ یہی بیگانگی اُس کی زندگی میں ایک سماجی المیہ بن کر ابھرتی ہے۔

تنویر انجم کی نظموں میں عورت کے سماجی المیہ کی تصویر کشی اس بات پر زور دیتی ہے کہ مرد کے پاس کتھارسس کے بے شمار مواقع ہوتے ہیں تا کہ وہ اپنی ذات کا ادراک کر سکے، جبکہ عورت کو گھر کی چار دیواری میں محصور رہ کر زندگی گزارنی پڑتی ہے اور اُس کے لیے سماجی دنیا میں قدم رکھنے کے مواقع محدود ہوتے ہیں۔ جب وہ باہر قدم رکھتی ہے، تو اُسے صرف ایک جنس یا "صارف" کے طور پر دیکھا جاتا ہے، نہ کہ ایک مکمل انسان یا فرد کے طور پر۔ اُسے صرف جسم کی صورت میں مابہ الفرق اور قیمت کا ایک عنصر سمجھا جاتا ہے۔

تنویر انجم اس سماجی حقیقت کی مخالفت کرتی ہیں اور ایک نئے شعور کی ضرورت پر زور دیتی ہیں، جہاں عورت کو نہ صرف جسم کے طور پر، بلکہ ایک مکمل انسان کی حیثیت سے سمجھا جائے۔ وہ چاہتی ہیں کہ عورت کو اپنی شناخت میں مکمل آزادی حاصل ہو، تا کہ وہ نہ صرف سماج میں بلکہ اپنی ذات میں بھی مکمل انسان کے طور پر جیتی ہو۔ تجارت کے دو بنیادی اصول ہیں: خرید و فروخت اور تبادلہ۔ کسی شے کے حصول کا تیسرا غیر اخلاقی راستہ چوری ہے۔ تنویر انجم عورت کے جسم اور جذبات کی تجارت کو فرد کی بے وقعتی سے تعبیر کرتی ہیں۔ اگر کسی معاشرے میں عورت کی قدر و قیمت صرف کاروباری مقاصد کے لیے ہو، تو وہ خود کو سماجی عمل سے الگ کر لیتی ہے۔ یہ علیحدگی بالآخر اُسے سماجی بیگانگی کے احساسِ جرم میں مبتلا کر دیتی ہے، جہاں وہ اپنی ذات کی بے وقعتی اور سماجی ناانصافیوں کا شکار ہو کر تنہائی کی اذیت جھیلتی ہے۔

عورت دیکھتی ہے کہ مرد صرف اس کے بدن کو اہمیت دیتا ہے اور اُس کے جذبات یا احساسات کی کوئی قدر نہیں کرتا، تو اُس کی بیگانگی اور مایوسی بڑھ جاتی ہے۔ مرد کی نظر میں عورت کی حیثیت محض ایک جنس کے طور پر رہ جاتی ہے، جس کا مقصد صرف جسمانی فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ یہ رویہ عورت کے اندر ایک ردِ عمل پیدا کرتا ہے، جو اکثر مرد سے نفرت یا سماج سے علاحدگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ عورت کا یہ ردِ عمل اُس کی ذاتی آزادی، عزت نفس، اور احساس کی بازیابی کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ تنویر انجم کی نظم میں بھی یہی جذبات اور خیالات نمایاں ہیں، جہاں عورت اپنی ذات کے خلاف ہونے والے اس استحصال اور ظلم کے بارے میں بات کرتی ہے۔ ان مصرعوں میں یہ ردِ عمل نہ صرف عورت کی خودی کی بازیابی کی کوشش کو ظاہر کرتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ عورت کے لیے اپنی حقیقت کو پہچاننا اور اس کی عزت و احترام کا مطالبہ کرنا ضروری ہے۔

یہ ایک فرد دوسرے فرد سے بیگانگی ہے۔ فرد جب اپنے آپ کو ایسے انسانوں میں گھرا دیکھتا ہے جہاں صرف اُسے فائدے یا نقصان کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہوتا ہے۔ تو وہ اُن سے کنارہ کشی اختیار کرنے میں عافیت خیال کرتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ یہ معاشرہ ان اقدار اور اُن اخلاقیات کے قابل ہی نہیں جن کا تخیل کسی فرد نے بنا رکھا ہوتا ہے۔ نتیجتاً فرد اپنے جیسے انسانوں سے بیگانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ تشکیک کا یہ رویہ فرد کو اپنے ہی جیسے افراد کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ فرد اپنے علاوہ دیگر لوگوں سے بے یقین ہو جاتا ہے۔ یہ بے یقینی کی کیفیت فرد کی بیگانگی کا سبب بنتی ہے۔

جنگوں اور بارود کی ایجاد نے فرد کو زندگی سے یقین کر دیا۔ موت کی ارزانی نے زندگی کی لایعنیت اور بے مقصدیت میں اضافہ کیا ہے۔ جنگوں کی وجہ سے فرد سے فرد کی نفرت اور بیگانگی میں اضافہ ہوا ہے۔ تنویر انجم نے جنگوں اور ان سے پھیلنے والے خوف و ہراس کی وجہ سے فرد میں در آنے والی بیگانگی کو نظمیہ اظہار دیا ہے۔ جنگوں نے معاشرتی مسائل اور معاشی دونوں میں اضافہ کیا۔ بھوک افلاس کی نسبت بڑھ گئی اور زندگی کی قیمت ارزاں ہو گئی۔ فرد نے اپنی بھوک مٹانے کے لیے اپنے ہی طرح کے انسانوں کا بھین کر صرف اپنی بھوک کے بارے میں سوچا۔ بھوک کی کیفیت میں فرد اخلاقیات کے تمام بنائے ہوئے اصول وضوابط بھول جاتا ہے۔ تنویر انجم کا یہ کہنا کہ "شاید اس وقت کہیں پر کسی بھوکے بچے نے کسی بم کو سیب سمجھ کر اُٹھا چاہا ہو اور زمین سے بکھر کر آسمان میں چلا گیا ہو۔"() ایسی ہی کیفیت کا اظہار ہے کہ بھوک میں فرد ہر ایک چیز کو خوراک سمجھتا ہے اور اپنی بھوک مٹانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ جنگیں بھی انسان اپنی بقا کے لیے لڑ رہا ہوتا ہے مگر دراصل یہ محض ذاتی بچاؤ ہوتا ہے جس کا نشانہ ایک نہ ایک دن انسان کو خود بھی بننا پڑتا ہے۔ انسان اپنی نسل کا آپ ہی دشمن بنا نتیجتاً اپنے موت کا ذمہ دار ٹھہرا۔ انسان اپنی فتح کے لیے شہر کے شہر اُجاڑ دیے اور اُسے لگا کہ اس نے اپنا وجود بچا لیا۔ تنویر انجم لکھتی ہیں:

"ہم زندہ ہیں
دشمنوں کے شہر اجڑ گئے
آپ بمباری نے
لاکھوں دشمنوں کو راتوں رات ختم کر دیا
آپ نہ ہوتے تو شاید
یہ سب ہمارے ساتھ ہوتا
ہم شاید مر چکے ہوتے"(۱۶)

یہ بے یقینی کی کیفیت اس لیے ہے کیونکہ معاصر عہد کا فرد یہ جانتا ہے کہ اگر وہ اپنی بقا کے لیے دوسرے کو شکست نہیں دے گا تو شاید اس کی اپنی بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ جنگ وجدل اور بہتا خون دیکھ کر ایک حساس فرد کا زندگی پر سے اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔ اُسے اپنی تمام جدوجہد لایعنی لگتی ہے۔ یہاں سے اُس کی بے عملی کا آغاز ہوتا ہے اور وہ اپنی ذات میں مقید ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ذات کی یہ قید اُسے زندگی سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ دنیا اُس کی نہیں ہے۔ وہ جس اخلاقیات اور روایات کی دنیا کا خواہاں ہوتا ہے اس کے وہ تمام تخیل ڈھ جاتے ہیں۔ وہ خود کو معاشرے میں بیگانہ سمجھنے لگتا ہے۔ موت کا خوف فرد کو ہر وقت گھیرے رکھتا ہے۔ موت کا خوف بذات خود فرد میں وجود کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ فرد چاہتا ہے کہ وہ اپنے وجود کو زندہ رکھے معاشرتی فنا و بقا کی جنگ اسے ہر وقت سرگرداں رکھتی ہے۔

س **حوالہ جات**

1) Fromm, Erich. *The Sane Society.* New York: Rinehart, 1955, p. 120.

۲) شاہین مفتی، جدید اردو نظم میں وجودیت، لاہور: سنگ میل پبلشرز، ۲۰۰۱ء، ص:۵

۳) ایضاً، ص:۴۵

۴) غفور قاسم، شاہ، پاکستانی ادب (شناختی کی نصف صدی)، راولپنڈی، کاریز پبلیکیشنز، ۲۰۰۰، ص:۲۶

۵) افتخار بیگ، مجید امجد کی شاعری اور فلسفہ وجودیت، مقالہ برائے ایم فل، اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۵ء، ص: ۱۴۴

6) Ollman, Bertell. *Alienation: Marx's Conception of Man in Capitalist Society.* Cambridge: Cambridge University Press, 1971, p. 131.

7) Gergen, Sheila. *Feminist Reconstructions in Psychology: Narrative, Gender, and Performance.* Newbury Park: Sage Publications, 2001, p. 85

8) De Beauvoir, Simone. *The Second Sex*. Translated by H. M. Parshley, Alfred A. Knopf, 1953, p.43

۹) تنویر انجم، نئی زبان کے حروف، کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۲۰ء، ص:۱۲

۱۰) ناصر عباس نیر، دیباچہ: مشمولہ نئی زبان کے حروف، ص:۳۲

۱۱) ایضاً، ص:۱۸۰

۱۲) ایضاً، ص:۳۲

۱۳) ایضاً، ص:۱۱۱

۱۴) ایضاً، ص:۶۰

۱۵) ایضاً، ص:۶۱

۱۶) ایضاً، ص:۶۸

۱۷) ایضاً، ص:۸۷

۱۸) ایضاً، ص:۴۰۱